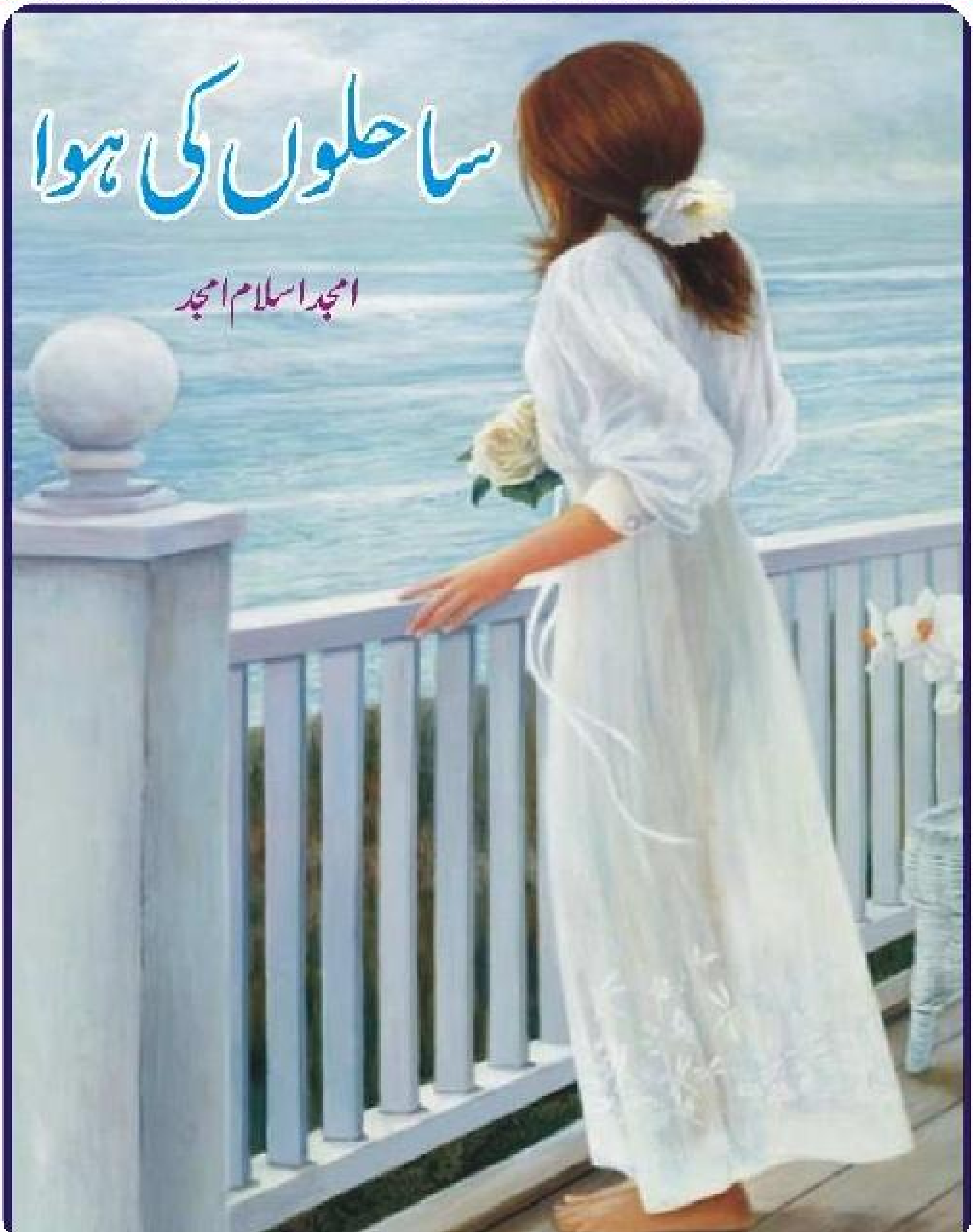
ساحلوں کی ہوا
امجد اسلام امجد

ساحلوں کی ہوا

امجد اسلام امجدؔ

حمد

ہر ایک لغزشِ پا کو سنبھالنے والا
وہی ہے سب کو غموں سے نکالنے والا

درونِ سنگ جو دیتا ہے رزق کیڑے کو
وہی ہے دل میں امیدوں کو پالنے والا

یہ کہکشاؤں کی شمعیں اسی سے روشن ہیں
کہ جس کا نور ہے روحیں اجالنے والا

شکست خوردہ دلوں کو نشانِ فتح وہی
وہی ہے بیج کو پھولوں میں ڈھالنے والا

بس اک نگاہ وہی گرہیں کھولنے والی
بس اک سخن وہی رستے نکالنے والا

فلک کو دیتا ہوا بے نشان پہنائی
زمین کی سمت ستارے اچھالنے والا

اسی نے لفظ کی حرمت لبوں کو سکھلائی
وہی ہے پاس وفا دل میں ڈالنے والا

درون جاں یہ ہدایت کی لو اسی سے ہے
وہی ہے روح کا زنداں اجالنے والا

◆◆◆

نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

عجب یہ رتبہ دعا کو ملا مدینے میں
کہ لفظ کوئی نہ خالی گیا مدینے میں

خوشا وہ آنکھ جو روضے کی جالیوں پہ کھلی
خوشا وہ دل کہ ہوا مبتلا مدینے میں

گیا تھا جب تو کوئی اور آدمی تھا میں
میں اپنے آپ سے واقف ہوا مدینے میں

نہ ایک پل کو ٹھہرتا نہ بند ہوتا ہے
ہوا مثال فضل خدا مدینے میں

وہ چند روز مری زندگی کا حاصل ہیں
میں جن کی چھاؤں میں آیا گیا مدینے میں

کوئی کہیں سے بھی آئے غریب شہر نہیں
عجیب راز یہ ہم پر کھلا مدینے میں

مگر یہ ایک کرشمہ ہے ان کی رحمت کا
کہ لو بھی لگتی ہے باد صبا مدینے میں

وہ بات ان کو پہنچتی ہیں جو دلوں میں ہو
بیاں سے پہلے ملے دعا مدینے میں

خوشی سے گھومو یہاں ناچتے پھرو امجد
کسی کو کوئی نہیں روکتا مدینے میں

◆◆◆

تیرے کوچے میں ٹھہرنے

تیرے کوچے میں ٹھہرنے کا بہانہ ہی سہی
تیرے ملنا جو نہیں جان سے جانا ہی سہی

زندگی ایک پہیلی ہے جدھر سے دیکھیں
یہ حقیقت نہ سہی، ایک فسانہ ہی سہی

ہم کو جانا ہے بہر طور، تمہاری جانب
راستہ روکے ہوئے ایک زمانہ ہی سہی

ہر دفعہ جسم نیا، قبر نئی ہوتی ہے
خاک سے خاک کا یہ میل پرانا ہی سہی

جس طرف تو ہے، ادھر ہوں گی سبھی کی نظریں
عید کے چاند کا دیدار، بہانہ ہی سہی

◆◆◆

انکشاف

نہ وعدہ ہے کوئی تم سے' کوئی رشتہ نبھانے کا
نہ کوئی اور ہی دل میں' تہیہ یا ارادہ ہے
کئی دن سے مگر دل میں
عجب الجھن سی رہتی ہے!
نہ تم اس داستاں کے سرسری کردار ہو کوئی
نہ قصہ اتنا سادہ ہے
تعلق جو میں سمجھا تھا کہیں اس سے زیادہ ہے!!

◆◆◆

ریگ رواں

وقت رکتا ہی نہیں ریگ رواں کی صورت
کوئی بنتی ہی نہیں نام و نشاں کی صورت

موسم گل کی طرح جب ہو خزاں کی صورت
کس طرح نکلے گی ایسے میں بیاں کی صورت

ثبت ہے وقت کا ایک ایک نشاں چہرے پر
ہم کو دیکھو جو نہ دیکھی ہو فغاں کی صورت

انتظار

میں جہاں گیا مرے ساتھ ہی
مری خواہشوں کا قفس گیا
وہ سحاب میں جسے دیکھنے کو ترس گیا
کہیں اور جا کے برس گیا
وہ جو پھول تھا مرے ہاتھ میں وہ بکس گیا
مری آنکھ کب سے ہے منتظر کسی موج باد بہار کی

◆◆◆

وقت کا دریا

آگ اور خاک کا سنگم ہے ہمارا ملنا
بیچ میں وقت کا دریا جو بہا جاتا ہے
کیسے ممکن ہو کنارے سے کنارا ملنا
اس قدر بھیڑ ہے تاروں کی سر محفل شب
سخت دشوار ہے قسمت کا ستارا ملنا

◆◆◆

شفیق الرحمن

بہت عجیب شخص تھا
تمام عمر جس قلم سے دوسروں کے واسطے
لکھے تھے اس نے قہقہے
اسی قلم سے اپنا کوئی ایک دکھ نہ لکھ سکا
بہت عجیب شخص تھا

◆◆◆

تیرا نام لیا

تیرا نام لیا
صبح و شام لیا

اس نے آنکھوں سے
کتنا کام کیا

ہم نے محفل میں
خالی جام لیا

گرتے گرتے بھی
تم کو تھام لیا

بیٹھے سوچتے ہیں
کیوں الزام لیا

روشن صبحوں سے
اک پیغام لیا

درس آزادی

زیر دام لیا

پیادے

شاہ و وزیر و فیل و رخ و اسپ سست رو
جتنے ہیں اس بساط پہ مہرے سجے ہوئے
سب ہی کی خیر ہو
لیکن اے خوش نگہ
جب کھیلنے کے واسطے بیٹھو تو دیکھنا
خود سے کلام کرتے ارادوں کی صف میں ہیں
کیا لوگ ہیں پیادوں کی صف میں ہیں

◆◆◆

دم بدم گھٹتی ہوئی

دم بدم گھٹتی ہوئی مہلت فسانی کی قسم
تشنگی بڑھتی چلی جاتی ہے پانی کی قسم

رات ڈھلتے ہی بدل جاتے ہیں سارے منظر
نشہ حسن کی صہبائے جوانی کی قسم

اس کا گھر راہ میں آئے تو وہیں رک جانا
دجلہ درد تجھے تیری روانی کی قسم

جاں بلب رہتا ہے جس شخص کے ہاتھوں یہ دل
اب بھی کھاتا ہے اسی دشمن جانی کی قسم

لفظ اظہار کے پابند ہیں، معنی کے نہیں
تیری خاموشی، مری شعلہ بیانی کی قسم

یہ وہ پستی ہے جسے رشک سے دیکھے نعت
خلد سے تا بہ زمیں نقل مکانی کی قسم

رنگ آنکھوں میں ہوا کرتے ہیں منظر میں نہیں

موسم گل کی قسم، شام خزانی کی قسم

◆◆◆

احتمال

بہت مشکل نہ ہو جائے
تمنا اب جو رہتی ہے مری بے خواب آنکھوں میں
کہیں یہ دل نہ ہو جائے

◆◆◆

کبھی آنکھ سے جو گرا نہیں

کبھی آنکھ سے جو گرا نہیں میں وہ اشک ہوں مرے دوستو
مرا ضبط ہے مری زندگی سو میں کیا کہوں مرے دوستو

میں تو اک حرف سوال ہوں میں تو ایک موج خیال ہوں
وہ سنے تو عرض وفا کروں، کہے تو بہوں مرے دوستو

تمہی میری رونق شہر تھے مری جاں تھے، معنی دہر تھے
مرا آس پاس اجڑ گیا، میں کہاں رہوں مرے دوستو

وہ جو پھول ہیں جو چراغ ہیں مرے نام کے وہ تمہیں ملیں
یہ جو زخم ہیں یہ جو داغ ہیں انہیں میں سہوں مرے دوستو

کہیں جیت کر تمہیں کھو نہ دوں تو شکست اپنی ہی مان لوں
مرے ظرف کا ہے یہ فیصلہ کہ میں چپ رہوں مرے دوستو

سب سے اچھے لفظ

میں صبح و شام لکھتا ہوں
زمین پر جس قدر اچھی زبانیں بولی جاتی ہیں
میں ان سے حرف چنتا
اور تمہارا نام لکھتا ہوں

◆◆◆

چراغ جلتے رہیں یا ہوا

چراغ جلتے رہیں یا ہوا ٹھہر جائے
تری نگاہ پہ ہر سلسلہ ٹھہر جائے

ٹھہر گیا ہے سر شام بہتا دریا بھی
کہیں یہ اب تو دل مبتلا ٹھہر جائے

کسی بھی حرف میں تاثیر ہی نہیں رہتی
دلوں کے بیچ اگر فاصلہ ٹھہر جائے

شب وصال میں کیسا عجب کرشمہ ہو
مقابل اس کے اگر آئینہ ٹھہر جائے

لرز رہا ہے ستارہ سا جو سر مژگاں
کچھ ایسا ہو ترے دامن پہ آ ٹھہر جائے

ترے سلوک سے ہوتا نہیں یہ اندازہ
کوئی اٹھے تری محفل سے یا ٹھہر جائے

قصور تھا کہ نہیں اس پہ خاک ڈالیں آپ
بس ایک بار ہے جو بھی سزا ٹھہر جائے

کسی کے وصل کا آیا نہیں ابھی موسم
کوئی بہار سے کہہ دو ذرا ٹھہر جائے

فنا کا کھیل ہے ہستی تو کیسے ممکن ہے
زوال عمر کا یہ سلسلہ ٹھہر جائے

پلٹ کے آئیں زمانے وہی محبت کے
کہ رنگ چلنے لگیں اور صبا ٹھہر جائے

کسی کا ساتھ ملے اور اس طرح امجد
کہ وقت چلتا رہے، راستہ ٹھہر جائے

◆◆◆

مجھے دیکھو

دریچہ یاد کا کھلتے ہی سب کچھ لوٹ آتا ہے
پرانے منظروں کو آنکھ پھر سے دیکھ پاتی ہے
تری تصویر بنتی ہے، تری آواز آتی ہے
غلط ہے
کہ کوئی گزرے کل میں جی نہیں سکتا
سرابوں میں بنے دریا سے پانی پی نہیں سکتا
مجھے دیکھو

◆◆◆

ایک پل

آہستگی سے گھٹتی ہوئی سہ پہر کی دھوپ
دل میں اتر رہی ہے کسی خواب کی طرح
نیلے فلک پہ ابر کے ٹکڑے کہیں کہیں
لرزاں ہیں دل کے ساز پہ مضراب کی طرح

صحن چمن میں ڈولتے رنگوں کے درمیاں
ہے ایک بے قرار سی خوشبو رکی ہوئی
ٹھہرے ہوئے سے وقت کی سرگوشیوں کے بیچ
تتلی کوئی ہے پھول کے لب پر جھکی ہوئی

پتے صبا کے پاؤں کی آہٹ کے منتظر
شاخوں کے درمیاں کوئی حیرت رواں سی ہے
بیٹھی ہے یوں وہ گھاس پہ پھولوں کے روبرو
آنکھوں کے آس پاس کوئی کہکشاں سی ہے

چہرے پہ دھوپ چھاؤں کا میلہ لگا ہوا
شانوں پہ بے دریغ سے گیسو کھلے ہوئے
قوس قزح نے اپنا خزانہ لٹا دیا

رنگت میں اس کی رنگ ہیں سارے گھلے ہوئے

آہٹ پہ میرے پاؤں کی دھیرے سے چونک کر
دیکھا ہے اس نے مڑ کے مجھے اس ادا کے ساتھ
پھیلی ہے جسم و جاں میں عجب ایک سرخوشی
خوشبو سی کوئی اڑنے لگی ہے ہوا کے ساتھ

کہتا ہے دل کہ اس سے کوئی بات کیجئے
لمحہ یہی بیان غم آرزو کا ہے
ایسا نہ ہو سحر یہ موسم کا ٹوٹ جائے
اس کم سخن سے وقت یہی گفتگو کا ہے

محبت کی اپنی الگ ہی زباں ہے

محبت سے خردمندی اگر مشروط ہوتی تو
نہ مجنوں دشت میں جاتا
نہ کوئی کوہ کن عشرت گہِ خسرو سجانے کو
کبھی تیشہ اٹھاتا اور
نہ کوئی سوہنی کچے گھڑے پہ پار کرتی
چڑھتے دریا کو
نہ تم برباد کرتے اس طرح میری تمنا کو
نہ میں الزام دیتا اپنی ناکامی پہ دنیا کو
محبت سے خردمندی اگر مشروط ہوتی تو

وفا کو پیش ہیں جو امتحاں

وفا کو پیش ہیں جو امتحاں نئے بھی نہیں
وفور شوق و دل بد گماں نئے بھی نہیں

نئے نئے نظر آتے ہیں اس گلی کے لوگ
کسی کا ذکر جو چھیڑیں تو ہاں نئے بھی نہیں

مرے جوار میں یہ روشنی سی کیسی ہے
ستارے یوں تو سر آسماں نئے بھی نہیں

یہ آج کیوں مرے آنسو تمہیں عزیز ہوئے
کہ سیل درد کے یہ ترجماں نئے بھی نہیں

تو ان کا نام نہ جانے تو اور بات ہے یہ
تری گلی میں یہ آوارگاں نئے بھی نہیں

وہی ہے کھیل وہی مرحلے وہی ہم تم
یقیں پرانے نہیں ہیں گماں نئے بھی نہیں

تمہارا غم

تمہارا غم سلامت ہے
تو پھر بازار ہستی میں
کسی کی کیا ضرورت ہے

◆◆◆

پس ہر آرزو آنکھیں تری ہیں

پس ہر آرزو آنکھیں تری ہیں
ہمارے چار سو آنکھیں تری ہیں

ستارے جھک کے باتیں سن رہے ہیں
کہ محو گفتگو آنکھیں تری ہیں

گل و شبنم میں تیرا عکس لرزاں
میان آب جو آنکھیں تری ہیں

بدن سے روح تک پھیلی ہے خوشبو
کچھ ایسی مشکبو آنکھیں تری ہیں

مرے زخموں کو نیند آنے لگی ہے
بہت تسکین خو آنکھیں تری ہیں

وہ کیا منظر ہے جس کے دیکھنے کو
بھٹکتی کو بہ کو آنکھیں تری ہیں

یہ بادل ہیں تری پلکوں کے سائے
ستارے ہو بہو آنکھیں تری ہیں

ترا الطاف ہے اپنا تعارف
ہماری آبرو آنکھیں تری ہیں

اجالے ہی اجالے ہر طرف ہیں
عجب خورشید رو آنکھیں تری ہیں

کہ جیسے ابر سے دریا کا رشتہ
ہماری جان تو آنکھیں تری ہیں

جو تو دیکھے تو ہم بھی جگائیں
ہماری جستجو آنکھیں تری ہیں

◆◆◆

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں

اے چشم یار تیرے ارادے کو دیکھ کر
ہاتھوں میں لے کے سر
ہم آ گئے ہیں آپ ہی مقتل کی راہ پر

کیسے کہیں کہ تم سے

کیسے کہیں کہ تم سے بچھڑنے کا غم نہیں
اتنے بھی خود فریب مری جان ہم نہیں

خواہش بقدر وسعت داماں زیاد ہے
مل جاؤ مجھ کو دوست مگر ایک دم نہیں

ہم سے بہت سہی تری گلیوں میں جان جاں
دیکھو کبھی تو شہر میں تم سے بھی کم نہیں

یہ دن ہیں احتیاط کے سقراط کے نہیں
کاسے میں سکے بولتے ہیں اور سم نہیں

تیرا سلوک اہل حد بخت نارسا
اسباب کون سا ہے جو ہم کو بہم نہیں

◆◆◆

ریت

ریت سرکتی ہے
ریت کا کام سرکنا ہے سو ریت سرکتی رہتی ہے
شہروں کی آواز کو سن کر
صحرا پیچھے ہٹ جاتے ہیں
چشمے خاک سے بھر جاتے ہیں
نخلستان سمٹ جاتے ہیں
ریت بھٹکتی رہتی ہے
ریت کا کام بھٹکنا ہے سو ریت بھٹکتی رہتی ہے
ریزہ ریزہ اس کو سمیٹیں
جاں پر بوجھ لیے رکھیں ہم
لاکھ جتن سے اس کو روکیں
مٹھی بند کیے رکھیں ہم
ریت پھسلتی رہتی ہے
ریت کا کام پھسلنا ہے سو ریت پھسلتی ہے

ساحل ساحل بکھری یادوں
آب رواں کی تحریروں کو
موج بہا کر لے جاتی ہے

ریت کی ساری تعمیروں کو

ریت بکھرتی رہتی ہے
ریت کا کام بکھرنا ہے سو ریت بکھرتی رہتی ہے

غم زمانہ سے دل کو

غم زمانہ سے دل کو بچا کے رکھتے ہیں
تمہارے خواب سے آنکھیں سجا کے رکھتے ہیں

بھٹک رہے ہیں ترے شہر میں گداگر سے
وہ چند لوگ جو سکے وفا کے رکھتے ہیں

یہ دور اہل ہوس ہے یہاں پہ اہل حیا
بدن سمیٹ کے آنکھیں جھکا کے رکھتے ہیں

تمہارے آنے کا سنتے ہی گھر کی چیزوں کو
کبھی اٹھاتے کبھی پھر سے لا کے رکھتے ہیں

سنا ہے کانوں کے کچے ہو تم بہت سو ہم
تمہارے شہر میں سب سے بنا کے رکھتے ہیں

بیان کس کا غلط ہے قصور وار ہے کون
چلو حساب یہ آگے خدا کے رکھتے ہیں

جو اہل درد ہیں امجد وہ غم گزیدوں سے
سخن بہار کے لہجے صبا کے رکھتے ہیں

◆◆◆

شہر سبا

تھی وہ بلقیس کی ہم نام مگر اس کے لیے
وقت نے کھیل کوئی اور رچا رکھا تھا
خواب کے دشت میں خواہش کے صنم خانے میں
وہ جو اک شہر سبا' اس نے بسا رکھا تھا
جس کی ہر راہ کو پھولوں سے سجا رکھا تھا

اس کے بام و در و دیوار کی تعمیر میں تھا
اس کے اجداد کا خوں
آگ اور خوف کے دریا سے گزر کر اس نے
پائی تھی صبح سکوں
پھر بھی بے چین بہت رہتی تھی آنکھیں اس کی
وہ جو اک شہر طلب شہر اماں شہر یقیں
اس کے احساس میں خوشبو کی طرح رہتا تھا
یہ تو وہ شہر نہ تھا
ان مکانوں کو تو گھر ہونا تھا
یہ تو وہ لوگ نہ تھے
ان کو تو اہل ہنر ہونا تھا
وہ بہت سوچتی رہتی تھی

یہی کہتی تھی
یہ وطن غیب کا تحفہ ہے اسے رہنا ہے
میں نہ ہوں گی نہ سہی
یہ جو دریائے محبت ہے تنک آب بہت
اس کو اک روز سمندر کی طرح بہنا ہے
میں نہ ہوں گی نہ سہی

◆◆◆

تیرا کیا بنے گا اے دل

کسی خواب سے فروزاں کسی یاد میں سمٹ کر
کسی حسن سے درخشاں کسی نام سے لپٹ کر

وہ جو منزلیں وفا کی مرے راستوں میں آئیں
وہ جو لذتیں طلب کی مرے شوق نے اٹھائیں

انہیں اب جمع کرکے کبھی دھیان میں جو لاؤں
تو ہجوم رنگ و بو میں کوئی راستہ نہ پاؤں

کہیں خوشبو کی جھلمل کہیں خواہشوں کے ریلے
کہیں تتلیوں کے جمگھٹ کہیں جگنوؤں کے میلے

پہ یہ دل فریب منظر کہیں ٹھہرتا نہیں ہے
کوئی عکس بھی مسلسل سر آئینہ نہیں ہے

انہیں کس طرح سمیٹوں کہ ہے کا تیز دھارا
سر موج زندگانی ہے فنا کا استعارا

یہی چند ثانیے ہیں مری ہر خوشی کا حاصل
نہ کھلے گرہ بھنور کی، نہ ملے نشاں کا حاصل
ترا کیا بنے گا اے دل! تیرا کیا بنے گا اے دل

◆◆◆

ارض وطن کے لیے

اک نظم لکھیں
اے ارض وطن ہم تیرے لیے اک نظم لکھیں
تتلی کے پروں سے رنگ چنیں
ان سازوں سے آہنگ چنیں
جو روح میں بجتے رہتے ہیں
اور خواب بنیں ان پھولوں کے
جو تیری مہک سے وابستہ
ہر آنکھ میں سجتے رہتے ہیں
ہر عکس ہو جس میں لاثانی
ہم ایسا اک ارژنگ چنیں
تتلی کے پروں سے رنگ چنیں
اور نظم لکھیں

وہ نظم کہ جس کے حرفوں جیسے حرف کسی ابجد میں نہیں
وہ رنگ اتاریں لفظوں میں جو قوس قزح کی زد میں نہیں
اور جس کی ہر اک سطر میں خوشبو ایسے لہریں لیتی ہو
جو وہم وگماں کی حد میں نہیں
اور جب یہ سب انہونی باتیں ان دیکھی ان چھوئی چیزیں

اک دوجے میں مل جائیں تو نظم بنے
اے ارض وطن وہ نظم بنے جو اپنی بنت میں کامل ہو
جو تیرے روپ کے شایاں ہو اور میرے ہنر کا حاصل ہو
اے ارض اماں، اے ارض وطن
تو شاد رہے آباد رہے
میں تیرا تھا، میں تیرا ہوں
بس اتنا تجھ کو یاد رہے
اس کشت ہنر میں جو کچھ ہے
کب میرا ہے
سب تجھ سے ہے سب تیرا ہے

یہ حرف و سخن، یہ لوح و قلم
سب اڑتی دھول مسافت کی
سب جوگی والا پھیرا ہے
سب تجھ سے ہے سب تیرا ہے
سب تیرا ہے

◆◆◆

پس منظر میں منظر گم

پس منظر میں منظر گم
دریا بیچ سمندر گم

ایک ہی طاق نسیاں میں
دارا گم سکندر گم

ریت کو جیسے نگلے ریت
غم ہے غم کے اندر گم

وقت کی اڑتی مٹی میں
کیسے کیسے لشکر گم

بنتے بنتے مٹتے رنگوں میں
میں رہتا ہوں اکثر گم

موتی گم ہے سیپی میں
میں ہوں اپنے اندر گم

ایک ہی حیرت میں امجد
دھرتی، آنکھیں، امبر گم

◆◆◆

معجزہ

محبت اور خواہش میں کئی بے نام رشتے ہیں
مگر جو غور سے دیکھیں
تو دونوں میں بہت سے فاصلے بھی اس طرح موجود ہیں جیسے
سمندر ایک ہوتا ہے
مگر اس کے کنارے ایک دوجے سے سراسر
اجنبی اور مختلف رستوں کو چھوتے ہیں
سو ایسا ہے
سے کے اس سمندر میں
جہاں ہر شے بدلتی ہے
وہاں ہم تم بھی بدلے ہیں، بدلنا تھا
کہ رشتے بھی ہمارے عکس کی صورت
بہت آہستگی سے اس طرح کروٹ بدلتے ہیں
بسا اوقات بستر پر پڑی چادر پہ سلوٹ تک نہیں پڑتی
نہ آنکھوں میں سفر کرتے پرانے رنگ ہی تبدیل ہوتے ہیں
نہ باتوں کے تسلسل میں کوئی دیوار آتی ہے

بس اتنا ہے
کہ خواہش کی بندھی مٹھی سے وہ جو ریت سی پل پل

پھسلتی ہے اسی کے بیچ میں شاید وہ جذبہ بھی کہیں ہوتا ہے
جس کو پیار کہتے ہیں
محبت نام ہے جس کا
کہیں ایسا بھی ہوتا ہے
ہمیں خود اپنے ہاتھوں سے پھسلتی ریت کی
ریزش کا اندازہ نہیں ہوتا
مگر وہ گرتی رہتی ہے
کبھی ہم اس کو پھر سے جمع کرنے اور اٹھانے کے لیے
کوشش بھی کرتے ہیں
مگر دن رات کی سرکش ہوائیں
اس قدر مٹی اڑاتی ہیں کہ کچھ بھی ہو نہیں پاتا
یہ دل فریاد تو کرتا ہے لیکن رو نہیں پاتا
تو وہ آنسو
کہ جن کو اس پھسلتی ریت میں بکھری محبت کو
دوبارہ زندگی دینا تھا اور شاداب کرنا تھا
نہیں بہتے
وہی آنکھیں کہ جن میں ہر گھڑی شمعیں سی جلتی تھیں
انہی چہروں پہ ہوتی ہیں مگر ان میں
محبت اور تعلق کو پرائی کو نہیں ہوتی
زمانہ ان کے اندر سے گزر کر خود تو جانے کس طرف جاتا
کہاں بسرام کرتا ہے

مگراس کے غبارِ راہ میں الجھے ہوئے رستے
کئی چہرے بدلتے ہیں
محبت کرنے والے شخص اوران کی محبت بھی
بدلتے وقت کی یلغار سے بچنے کی خاطر اک
نئی صورت میں ڈھلتے ہیں
وفا ہارے ہوئے میداں سے جو پرچم اٹھاتی ہے
انھی لشکر نہیں ملتا
گزرتے وقت کے آشوب میں چہرہ بدلتا ہے
تو پھر پیکر نہیں ملتا
سو جانِ جاں اگر ہم تم
بدلتے وقت کی اس تیز آندھی میں ابھی تک ایک ہیں
اور ایک دوجے کے لیے بے چین رہتے ہیں
تو شاید یہ ہمارے بخت کی خوبی ہماری خوش نصیبی ہے
کہ ہم دونوں گزرتے وقت کی سرکش روانی میں
بہے بھٹکے تو ہیں لیکن
ہمارے ساحلوں کا رخ کسی لمحے نہیں بدلا
یہ حسنِ اتفاق ایسا ہے جو قسمت سے ملتا ہے
بہت کڑوا سہی لیکن یہی سب سے بڑا سچ ہے
کہ جو لمحہ گزر جائے
وہ کتنا بھی مقدس قیمتی یا خوبصورت ہو
کبھی واپس نہیں آتا

محبت اور خواہش اور ان کے درمیاں پھیلے ہوئے
بے نام رشتے بھی انہی چیزوں میں شامل ہیں
جنہیں یہ وقت کا دریا
ہمارے چاہنے ناں چاہنے سے بے نیاز و بے خبر ہو کر
پرانی ڈائری پچھلے کیلنڈر کی طرح تبدیل کرتا ہے
اسے اک معجزہ کہیئے
کہ خواہش کے سفر میں ہم نے جتنے موڑ کاٹے
جس قدر رہوار بدلے ہیں
وہ سب اک ساتھ بدلے ہیں
نہ گرتی ریت بدلی ہے نہ اپنے ہاتھ بدلے ہیں
اسے اک معجزہ کہیئے

◆◆◆

دیکھوں دل آئینے میں

دیکھوں دل آئینے میں تجھے آشکار پھر
توفیق دے مجھے مرے پروردگار پھر

جب آدمی کی ذات سے اٹھنے لگے یقیں
میں دیکھتا ہوں اس کی طرف ایک بار پھر

آنکھوں سے ہو نہ پائی تھی مانوس روشنی
رستوں میں آ گئی ہے شب انتظار پھر

جائے گا کیا نہ دور خزاں اس چمن میں اب
آئے گی کیا نہ لوٹ کے فصل بہار پھر

جس میں حساب سود و زیاں درمیان ہو
امجد وہ عشق بھی تو ہوا کاروبار پھر

ایک انوکھی کہانی

اربوں' کھربوں' تاروں اور سیاروں کی اس
بھیڑ میں رک کر دیکھ سکیں تو
اپنی زمیں کی ساری وسعت اور پھیلاؤ
دنیا بھر کے صحراؤں میں پھیلی ریت کا اک ذرہ یا
ممکن ہے اس سے بھی کم ہو
لیکن پھر بھی
اس موہوم سے ذرے اندر
کیسی کیسی دنیا ئیں اور کیا کیا منظر بستے ہیں
دیکھنے والی آنکھیں روز بدل جاتی ہیں منظر بجھتے رہتے ہیں
لیکن ہر منظر کے اندر اپنا ایک تماشا ہے
دیکھنے والی سب آنکھوں کی اپنی اپنی دنیا ہے
سورج کی شرطوں پر چلتا یہ جو ہمارا
جلتا بجھتا سیارا ہے
اب تک کے معلوم جہانوں کی یہ واحد آبادی ہی
آدم کا اور اس کی ساری نسلوں کا گھوارا ہے
ہست و بود کے جتنے منظر جتنے رنگ ہیں
ان سب کا ورتارا ہے
کیسا عجب تماشا ہے یہ

ایک ہی آدم کی اولادیں ایک ہی دھرتی پر رہتی ہیں
لیکن پھر بھی
اک دوجے کے بیچ میں کتنی دیواریں ہیں
رنگوں، نسلوں، ملکوں کی
دولت اور عقیدوں کی
جن سے دنیا ہم سب کی یہ ایک ہی دنیا
ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے
کوئی کسی کا میت نہ ہوگا، لمحوں کا فرمان یہی ہے
ہر گلشن کا رنگ جدا ہے موسم کا اعلان یہی ہے
ہم جس خلقت کا حصہ ہیں اس کی سب پہچان یہی ہے
بے چہرہ ہیں سب کے ہونٹ سوالی رہتے ہیں
بھوک کی بولی بولتی آنکھیں
پیٹ کے اندر ہوتی ہیں جو اکثر خالی رہتے ہیں
آئی ایم ایف اور اسی طرح کے کئی ادارے
اس کے رزق کا لقمہ لقمہ گنتے ہیں اور اس کو اس کے
اپنے ہی پیڑوں کا پھل بھی بھیک کی صورت ملتا ہے
یوں لگتا ہے جیسے سب اخلاقی قدریں سارے رشتے
صرف کتابوں میں ہوتے ہیں
جیسے بس یہ زور آور ہیں اصل حقیقت
باقی سارے قصے ہیں
ایک شکستہ آئینے کے ٹوٹے بکھرے حصے ہیں
ٹوٹے بکھرے ان حصوں کو جوڑے کون
چاروں اور سے گھیرا کرتی دیواروں کو توڑے کون

یوں لگتا ہے
جیسے یہ اک خواب ہے جس کی کوئی بھی تعبیر نہیں
ٹکڑے ہو کر پھر سے ملنا دھرتی کی تقدیر نہیں
شاید یہ سب ٹھیک ہو لیکن
دل کہتا ہے
اس سارے سنسار سے اوپر
اور کوئی بھی تو رہتا ہے
جس کے حکم سے وقت کا دھارا
رکتا بھی ہے اور بہتا ہے
یہ جو اندر سے اٹھتی ہے ایک صدا انجانی سنئے
آیئے ایک کہانی سنئے
مکتب کی دیوار پہ چسپاں کرہ ارض کا اک نقشہ تھا
اس نقشے پر بنے ہوئے تھے کتنے ہزاروں شہر اور قصبے
نہریں جھیلیں دریا جنگل
گہرے اور منہ زور سمندر، ساحل، کوہستان
برفوں کے بے پایاں وسعت، جلتے ریگستان
اک دن اک بچے نے یونہی
کھیل کھیل میں نقشے والا کاغذ یکدم پھاڑ دیا

اور

اک اک کر کے اس کے اتنے ڈھیروں ٹکڑے کر ڈالے
جن کو اب ترتیب سے واپس جوڑ کے رکھنا ناممکن تھا
ٹیچر نے بچے کو ڈانٹا
جب تک سارے ٹکڑے جوڑ کے نقشے کو ترتیب مطابق نہیں کرو گے

تم کو چھٹی نہیں ملے گی

جاؤ اس کونے میں بیٹھو

اور یہ سارے پرزے جوڑو

سارا نقشہ پھر سے اس کی اصلی شکل میں واپس لاؤ

ٹیچر دل میں سوچ رہا تھا

کام بہت مشکل ہے لیکن بچے کی اصلاح کی خاطر اتنی سختی لازم ہے

لیکن اس کی حیرت کی تو حد نہ رہی جب اس نے دیکھا

بچہ پانچ منٹ میں سارا نقشہ جوڑ کے لے آیا تھا

ہر شے اپنی جگہ پر ٹھیک طرح سے رکھی تھی

اس نے پوچھا

''تم نے اتنے ڈھیروں ٹکڑے اتنے تھوڑے وقت میں آخر

کیسے جوڑ لیے؟''

بچہ بولا

''اس نقشے کے پیچھے ایک انسان کا چہرا بنا ہوا تھا

میں نے جب وہ چہرہ جوڑا

دنیا کے نقشے کے ٹکڑے خود ہی جڑ کر

اپنی جگہ پر آ بیٹھے ہیں''

کیا یہ ایک کہانی ہے!

◆◆◆

فنا کی راہ پر کوئی

فنا کی راہ پر کوئی دوبارہ جا نہیں سکتا
گزرتا پل کبھی پھر سے گزارا جا نہیں سکتا

بہت نزدیک ہو کر بھی وہ اتنا دور ہے مجھ سے
اشارہ ہو نہیں سکتا' پکارا جا نہیں سکتا

یہ مد و جزر دنیا کھیل ہے سانپ اور سیڑھی کا
یہاں سے اور آگے استعارا جا نہیں سکتا

اسے میں کسی طرح پاؤں وہ مجھ تک کس طرح پہنچے
کہ اپنی راہ سے ہٹ کر ستارا جا نہیں سکتا

جہاں تک خواہشیں اس آدم خاکی کی جاتی ہیں
وہاں تک زندگی کا گوشوارا جا نہیں سکتا

کوئی پوچھے کہ آخر یہ وفا کا بوجھ کیسا ہے
سہارا بھی نہیں جاتا اتارا جا نہیں سکتا

سرکتی ریت رستوں کی نشانی بن نہیں سکتی
سے کی رہگزر میں گھر اسارا جا نہیں سکتا

کہیں پہ رک بھی سکتا ہے ہمارے عشق کا سودا
کہ جاناں حد سے آگے تو خسارا جا نہیں سکتا

◆◆◆

نیلسن منڈیلا کے لیے ایک نظم

چاروں جانب ایک مسلسل تاریکی تھی
جس میں دن اور رات کے آنے جانے کا احساس نہیں تھا
کوئی اس کے پاس نہیں تھا
زنداں کے دیوار و در پر سایہ کرتی خاموشی کو
پہرے پر مامور، دھمکتے قاتل قدموں کی آوازیں
اور بھی گہرا کر دیتی تھیں
وہ آوازیں جن کو سنتے اس زمانے بیت گئے تھے
پورے بیس اور سات برس
اتنے برس تو' قاتل قدموں والے ان بیدادگروں میں
کچھ کی پوری عمر نہیں تھی
جانے کس مٹی سے بنا تھا
زنداں کی دیوار سے لگ کر بیٹھا وہ خاموش ''ارادہ''
اپنے سے مجبور' نہتے' کالے لوگوں کا ''شہزادہ''
ایک انوکھا آدم زادہ
جس کی روح میں کھلتے پھول کی روشن خوشبو
زنداں کی دیوار سے باہر قریہ قریہ پھیل رہی تھی
اس کی آنکھیں ایسے خوابوں سے روشن تھیں
جن کی لو میں لمحہ لمحہ طوق و سلاسل پگھل رہے تھے

اس کے ذہن میں ان تعمیروں کے نقشے تھے
جن کے چاروں جانب دہشت کا ڈیرا تھا
لاشیں تھیں اور سپنے تھے
مرنے والے سب اس کے ہمزاد تھے‘اس کے اپنے تھے
بے چہرہ سے لوگ جو اپنے
گھر کے ہوتے بھی بے گھر تھے
جن کی آنکھیں لہولہو تھیں
جن کے منظر‘ بے منظر تھے
وہ زندانی‘ وہ تنہا خاموش ہیولا
اک ایسا ’’اظہار‘‘ تھا جس کے
اک اک نقش میں لاکھوں چہرے سمٹ گئے تھے
اک ایسا ’’انکار‘‘ تھا جس میں
بل والوں کے گھڑے ہوئے لفظوں کے معنی الٹ گئے تھے
ایک ایسی ’’دیوار‘‘ تھا جس سے
کتنے ہی طوفان اچھلتے آئے تھے اور پلٹ گئے تھے
اس کی روح کے اندر جیسے چاروں جانب آئینے تھے
اس کو پتہ تھا
حد نظر تک پھیلی یہ تاریکی اپنی حد رکھتی ہے
زنداں کی دیوار کے باہر
اس کے خواب کی روشن خوشبو سینہ سینہ پھیل رہی ہے
اس کو پتہ تھا

وہ دن اب کچھ دور نہیں جب اس کی دھرتی
''اس'' کی ہوگی اور سراسر گلشن ہوگی

جب وہ دنیا
آدرش اور امکان کی دنیا
ناممکن سے ''ممکن'' ہوگی
نئی صدی کے دروازے پر کھڑی یہ دنیا
جب جب پیچھے دیکھے گی تو ''اس'' کا سایا
منظر منظر پھیلا ہوگا
آدم کی توقیر کا قصہ جب بھی لکھا جائے گا
جلی قلم سے درج سنہرے اور دمکتے کچھ حرفوں میں
اس کا نام بھی لکھا ہوگا

حقیقت کے نگر میں جاگتے

حقیقت کے نگر میں جاگتے لمحوں میں پھیلے گا
مرا خواب تمنا شہر کے رستوں میں پھیلے گا

یہی آواز کا صحرا یہی راتوں کا سناٹا
پرندوں کی صدا بن کر مری صبحوں میں پھیلے گا

محبت رنگ ہے ایسا کہ روکے سے نہیں رکتا
کبھی پھولوں میں بکھرے گا کبھی تاروں میں پھیلے گا

دما دم نت نئی کچھ کہکشائیں بنتی جاتی ہیں
وہ اک لمحہ نجانے کس قدر قرنوں میں پھیلے گا

اکیلے ساحلوں کی سرد راتوں میں یہ لپٹا ڈر
کئی بہروپ بدلے گا' کئی چہروں میں پھیلے گا

بڑے جتنوں سے جو غم کا دھواں میں نے سمیٹا تھا
کسے معلوم تھا اک دن تری آنکھوں میں پھیلے گا

یہی لمحہ وفا کا جو ہمارے بیچ ٹھہرا ہے
اسے محفوظ کر لیں تو کئی صدیوں میں پھیلے گا

وفا کے بام و در پہ ڈولتا یہ ہجر کا سایا
مری صبحیں اجاڑے گا تری شاموں میں پھیلے گا

میں ہٹ جاؤں گا منظر سے مگر امجد مرا جوہر
دھنک میں سانس لے گا' ان بنے رنگوں میں پھیلے گا

◆◆◆

کس کو معلوم تھا؟

یونہی چلتے ہوئے راستوں میں کئی ہم سفر جو ملے
اور بچھڑتے گئے
آتے جاتے ہوئے موسموں کی طرح
آپ ہی اپنی گردِ سفر ہو گئے
نہ کبھی میں نے پھر مڑ کے دیکھا انہیں اور نہ سوچا کبھی
وہ کہاں کھو گئے
جو گئے، سو گئے

پھر یہ کیسے ہوا
یوں ہی اک اجنبی، دیکھتے دیکھتے
دل میں اترا، نظر میں سما سا گیا
اور دھنک رنگ جذبے جگا سا گیا
جیسے بادل کوئی، بے ارادہ یونہی، میری چھت پہ رکا
اور برسے بنا اس پہ ٹھہرا رہا
کیا تماشا ہوا سامنے تھی ندی اور کوئی تشنہ لب
اس کو تکتا گیا اور پیاسا رہا
ایک لمحے میں سمٹے گی یہ داستاں
کس کو معلوم تھا
تم ملو گے مجھے اس طرح بے گماں
کس کو معلوم تھا

بارش اور ہم

بارش تھی ہم تھے اور گھنی ہو رہی تھی شام
تم نے لیا تھا کانپتے ہونٹوں سے میرا نام

میں نے کہا تھا' آؤ یونہی بھیگتے چلیں
ان راستوں میں دیر تلک گھومتے رہیں

میری کمر میں ہاتھ یہ پھولوں سا ڈال کر
کاندھے پہ میرے رکھے رہو یونہی اپنا سر

ہاتھوں کو میں کبھی' کبھی بالوں کو چوم لوں
دیکھو مری طرف تو میں آنکھوں کو چوم لوں

پانی کے یہ جو پھول ہیں رخ پر کھلے ہوئے
ان میں دھنک کے رنگ ہیں سارے گھلے ہوئے

ہونٹوں سے ان کو چنتے رہیں خوشدلی کے ساتھ
تارے ہمیں تلاش کریں' چاندنی کے ساتھ

یونہی کسی درخت کے نیچے کھڑے رہیں
بارش کے دیر بعد بھی لپٹے کھڑے رہیں

تم نے کہا تھا، آؤ چلیں رات آ گئی
دل جس سے ڈر رہا تھا وہی بات آ گئی

بیتے سمے کی یاد ہی رستوں میں رہ نہ جائے
یہ دل کہیں وصال کی بارش میں بہہ نہ جائے

کچھ دیر ایک چپ سی رہی درمیان میں
گرہیں سی جیسے پڑنے لگی ہوں زبان میں

تم پیچھے ہٹنے والے تھے، جانے کے واسطے
آنکھیں جھکا رہے تھے، چرانے کے واسطے

یک دم گرا تھا پھول کوئی شاخسار سے
دیکھا تھا تم نے میری طرف اضطرار سے

بارش میں بھیگتے ہوئے جھونکے ہوا کے تھے
وہ چند بے گمان سے لمحے بلا کے تھے

نشہ سا ایک چاروں طرف پھیلتا گیا
پھر اس کے بعد میں نے تمہیں کچھ نہیں کہا

◆◆◆

حکیم محمد سعید کے لیے

کوئی خواب تھا
کسی اور خواب کے درمیاں کوئی خواب تھا
جو بکھر گیا
وہ بکھر گیا تو ٹھہر گئیں کئی سسکیاں سی ہواؤں میں
وہ جو شہر، شہر نگار تھا کسی آنکھ میں
اسی شہر جاں کی فضاؤں میں
وہی آنکھ دشنہ تیرگی کا ہدف بنی
وہی شہر پل میں اجڑ گیا
وہ جو اک شجر تھا وقار کا
وہ جو نامہ بر تھا بہار کا
کسی موڑ پر جو رکا نہیں
وہ جو کٹ گیا پر جھکا نہیں

وہ پڑا رہا کسی صبح اپنی ہی چھاؤں میں
اسی شہر جاں کی فضاؤں میں
وہ جو ہاتھ رہتا تھا مضطرب سر نبض جاں
وہ جو اک تبسم جانفزا کسی رخ پہ تھا
وہ جو دھیمے دھیمے سے حرف تھے کسی ہونٹ پر

وہ نہیں رہے

وہ نہیں رہے تو پتہ چلا
یہ جو گرد اڑتی ہے کو بہ کو
یہ جو چار سو کسی بے دلی کا حصار ہے
کوئی نیم سوزی راکھ ہے کوئی بے جہت سا غبار ہے
اسی راکھ میں اسی گرد میں
مری آنکھ سے تری آنکھ تک
وہی خواب اب کسی اور خواب کے درمیان ہے مشکبو
وہ جو خون خاک میں مل گیا
مری فصل گل کی ہے آبرو مرے شہر جاں کی بہار ہے
اسی تیرگی میں یہیں کہیں کسی روشنی کا مزار ہے

◆◆◆

آنکھ میں منظروں میں

آنکھ میں منظروں میں پانی ہے
پیاس کی پھر بھی حکمرانی ہے

ڈھیر ہے روز و شب کی لاشوں کا
لوگ کہتے ہیں زندگانی ہے

ہم ہیں دو مختلف کناروں پر
بیچ میں وقت کی روانی ہے

دل کے رستے میں آ گئی دنیا
یہ کہانی بہت پرانی ہے

ایک چھوٹی سی گیند ہے یہ زمیں
اور خلاؤں کے بے کرانی ہے

ہر حقیقت ہے مائل اظہار
کر گزر جو بھی دل میں ٹھانی ہے

دور ہٹتے ہوئے ستاروں میں
اس کی وحدت کی اک نشانی ہے

◆◆◆

کناروں پر جو بہتا ہے

کناروں پر جو بہتا ہے اسے دریا نہ سمجھو تم
کہ دریا کی روانی تو اسی شورِ تلاطم
اور بھنور سے جانی جاتی ہے
جہاں لہریں سفینوں کو اٹھاتی اور پٹختی ہیں
تو اگلا پل کوئی موہوم سے تحریر لگتا ہے
ہر اک لمحہ اسیرِ روزنِ تقدیر لگتا ہے

سو جانِ جاں، محبت بھی
کسی دریا کی صورت ہی سفر آغاز کرتی ہے
کنارے سے نہیں چلتا پتہ اس کے تلاطم کا
کہ جو لہریں لبِ ساحل سپر انداز ہوتی ہیں
وہ دریا کی تھکن، پانی کی پسپائی بتاتی ہیں
کنارے پر کھڑی کشتی کے سالم بادبانوں کو
ہوا جب چھو کے چلتی ہے تو سب کچھ ٹھیک لگتا ہے
ہم اک دوجے کی چاہت میں کوئی دعویٰ جو کرتے ہیں
وہ روحوں میں اترتے کیف کی تصدیق لگتا ہے
مگر یہ خوش نما گھاتیں، حسین و دلربا باتیں
کناروں سے نکلتے ہی تلاطم خیز موجوں کی روانی

اور بہاؤ میں کئی چہرے بدلتی ہیں

کہ دریائے محبت بھی

زمیں پر بہنے والے دوسرے دریاؤں جیسا ہے

سوچاہت اور تعلق کی وہی باتیں حقیقت ہیں

جو دریا میں کہی جائیں

کہ دریا ان کو سنتا ہی نہیں دل میں بھی رکھتا ہے

کنارے جب کناروں سے' کنارا کرنے لگتے ہیں

تو اس لمحے وہ چپکے سے

ہمارے درمیاں آ کر ہمیں آواز دیتا ہے

وہ سب باتیں سناتا ہے

کہ جو اک اور موسم میں کوئی عرفان لگتی تھیں

کناروں کے تحفظ میں بہت آسان لگتی تھیں

سنو جاناں' تلاطم میں

کناروں پر کہی باتوں کو جو تکریم کرتے ہیں

وہی دل ہیں کہ جن کی خود بھنور تعظیم کرتے ہیں

بچا کر کچھ چمکتے دن

چرا کر کچھ حسیں راتیں

چلو آؤ کہ دریا میں

کریں پھر سے یہی باتیں

کناروں پر جو بہتا ہے اسے دریا نہ سمجھو تم

◆◆◆

شام تھی ساعت زوال میں گم

شام تھی ساعت زوال میں گم
زخم تھا اپنے اندمال میں گم
حد ادراک میں تھا جو بھی کچھ
سب تھا بس ایک ہی سوال میں گم

تیز آندھی میں کا چراغ کی لو
برف میں کیسی آبلہ پائی
کارنس پر تھے پھول سوکھے ہوئے
سیڑھیوں میں بچھی تھی تنہائی

خواب تھے کھڑکیوں میں آویزاں
زینت طاق تھی شکیبائی
ایک ناطاقتی تھی چاروں طرف
راستہ راستہ تھی پسپائی

کہکشاؤں کے درمیاں لرزاں
ایک نامختتم سی پہنائی
فاصلے تھے فریب آنکھوں کا
ناپتا کون غم کی گہرائی

اک گریزاں سے عکس کی خاطر
آئینے ہو رہے تھے سودائی
یوں ستارے تھے منتظر جیسے
در محبوب پر تمنائی

وقت تھا روز و شب کی چال میں گم
میں تھا اپنے کسی خیال میں گم

◆◆◆

وہ

باتیں کرتے ہونٹ اچانک رک جاتے اور
آنکھیں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتی تھیں
دھیان کا رستہ کھو جاتا تھا
محفل میں جس سمت وہ جاتی
کمرے کا وہ حصہ جیسے یک دم روشن ہو جاتا تھا
جادوگر تھیں آنکھیں اس کی
پلکیں تھیں اک راز
روح بھی جھلمل کر دیتی تھی
ایسی تھی آواز

اور جو کچھ ہے واہمہ

اور جو کچھ ہے واہمہ ہے بس
ایک میں اک مرا خدا ہے بس

منزلیں سب کی اپنی اپنی ہیں
وقت تو ایک راستہ ہے بس

نقش ہے کوئی اور نہ عکس اس کا
زندگی ایک آئینہ ہے بس

میں زمانے سے ہوں کہ یہ مجھ سے
اک یہی دل کو وسوسہ ہے بس

جسم کی احتیاج سے آگے
صرف انسان سوچتا ہے بس

جو تماشا بھی ہے یہیں پر ہے
اس سے باہر تو اک خلا ہے بس

کوئی لمحہ ہو یا کوئی کردار
جو گیا، سو چلا گیا ہے بس

اک چکا چوند سی ہے چاروں طرف
کوئی کانوں میں کہہ رہا ہے بس

میرے اور اس کے درمیاں امجد
ایک لمحے کا فاصلہ ہے بس

◆◆◆

گلیاں

نظم لکھی گئی تو "ہنوئی" کی گلیوں سے موسوم تھی
اس میں گرتے بموں سے نکلتی ہوئی موت کا
تذکرہ تھا' تباہی فلاکت' دکھوں
اور بربادیوں کی اذیت بھری داستاں درج تھی
اس کے آہنگ میں
موت کا رنگ تھا اور دھن میں تباہی
ہلاکت' دکھوں اور بربادیوں کی الم گونج تھی
نظم کی اک بڑے ہال میں پیش کش کی گئی
اک گلوکار نے اس کو آواز دی
اور ساز یے والوں نے موسیقیت سے بھری
دھن بنا کر سجایا اسے
ساز و آواز کی اس حسیں پیش کش کو
سبھی مجلسوں میں سراہا گیا

جب یہ سب ہو چکا تو کچھ ایسے لگا
جیسے عنواں میں
شہر کا نام بھولے سے لکھا گیا ہو
حقیقت میں یہ نام "سائگان" تھا

اور ہر چیز جس رنگ میں پیش آئے وہی اصل ہے

سچ تو یہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں
شاعری اور نغمہ گری کی زباں ایک ہے
جیسے گرتے بموں سے نکلتی ہوئی موت کی داستاں ایک ہے
اور جیسے تباہی' فلاکت' دکھوں اور بربادیوں کا نشاں ایک ہے
سچ تو یہ ہے کہ کرہ ارض پر
دوسرے شعر گو کی ضرورت نہیں
ہر جگہ شاعری کا سماں ایک ہے
اس کے الفاظ کی بے نوا آستینوں پہ حسب ضرورت
ستارے بنانا' مقامی حوالوں کے موتی سجانا
تو ایڈیٹروں کے قلم کی صفائی کا انداز ہے
وزیر ثقافت کے دفتر میں بیٹھے
کلرکوں کے ہاتھ کا اعجاز ہے

◆◆◆

(D. J. Enright کی نظم Streets کا آزاد ترجمہ)

بساط وقت پہ دائم

بساط وقت پہ دائم نشاں کسی کا نہیں
زمیں کسی کی نہیں، آسماں کسی کا نہیں

ذرا سی ٹھیس پہ سب کچھ بکھر سا جاتا ہے
سنو یہ کوچہ شیشہ گراں کسی کا نہیں

یہ جتنے روپ ہیں سب آدمی کے اپنے ہیں
کہ رنگ موسم عمر رواں کسی کا نہیں

ہر ایک مدعی اپنے ہی مدعا کا ہے
عجیب لوگ ہیں کوئی یہاں کسی کا نہیں

بس ایک کھیل ہے ساحل کا اور سمندر کا
بھنور کسی کا نہیں، بادباں کسی کا نہیں

خزاں کے جشن میں مصروف ہے چمن ایسے
کہ جیسے قتل بہاراں زیاں کسی کا نہیں

یہ کیسی سوچ ہے امجدؔ یہ کیسا منظر ہے
ہے آگ شہر کی سانجھی دھواں کسی کا نہیں

◆◆◆

ہم دوست بنیں کیسے؟

وہ کہتا ہے
مرے ماضی کے رستوں کے پرانے ہم سفر آجا
ہم اچھے دوست بن جائیں
بھلا کر سب گلے شکوے
ہر اک رنجش کو رکھ کر در گزر کے طاق میں
دیکھیں
ہوا کے ہاتھ میں آتے دنوں کے جو شگوفے ہیں
انہیں کس طور کھلنا ہے
ہمیں کس راہ پر چلنا اور کہاں سے موڑ مڑنا ہے
کہ اپنے دکھ ہیں سانجھے اور خوشیاں ایک جیسی ہیں
ہمارے لوگ سرحد کے ادھر ہوں یا ادھر ان کے
گھروں میں ایک سے فاقے ہیں آنکھیں ایک سی خالی
ہیں مستقبل کے اندیشوں کی گلیاں ایک جیسی ہیں
میں کہتا ہوں
یہ سارے خوبصورت لفظ جذبوں سے بھرے جملے
محبت آشنا باتیں
بہت اچھی تو لگتی ہیں
مگر جو ہاتھ تم مجھ سے ملانے کے لیے آگے بڑھاتے ہو

وہ لاکھوں بے نوا کشمیریوں کے خوں سے رنگیں ہے
تمہارے پاؤں کے نیچے مرے اپنوں کی لاشیں ہیں
فضا میں عورتوں کی سسکیاں بچوں کی چیخیں ہیں
درختوں اور گھروں میں آگ کے شعلے لپکتے ہیں
دھواں رستوں میں پھیلا ہے
دھواں آنکھوں میں پھیلا ہو
تو ایسے میں
بتاؤ کس طرح ہم درد کے رشتے' وفا کے راستے دیکھیں
محبت کا کوئی موسم ہمارے درمیاں اترے
دلوں کی سرزمینوں سے
کہو کیسے
وفا نا آشنا لمحوں کا یہ سیل رواں اترے
نشانِ امن کی جو فاختہ تم نے اڑائی ہے
بتاؤ وہ کہاں اترے

◆◆◆

منظر میں جب تو ہی نہیں

منظر میں جب تو ہی نہیں تھا کیا کرتی بینائی بھی
بستی بستی گھوم آئے ہیں ہم بھی اور تنہائی بھی

عشق میں کس کو کیا ملتا ہے اپنی اپنی قسمت ہے
ایک ہی سکے کے چہرے ہیں، عزت بھی رسوائی بھی

اپنے دھیان میں ایسے گم تھے اس کی گلی بھی چھوڑ آئے
کم کم ہوں گے اس دنیا میں ہم جیسے سودائی بھی

بھرتے بھرتے بھر گئے سارے زخم تمہاری فرقت کے
آتے آتے آ گئی آخر ہم کو راس جدائی بھی

یوں بھی نہیں ہے ہم وہ گلیاں بالکل بھول گئے ہوں
اور بہت سی باتوں کے سنگ یاد تمہاری آئی بھی

اب کے تمہارے شہر سے بھی ہم سیلانی سے گزرے ہیں
تلخ بہت یہ بات سہی پر، اس میں ہے ''سچائی'' بھی

سے کی دیمک اندر اندر جانے کیا کچھ کھا جاتی ہے
تم چاہو تو کہہ لو ہم کو جھوٹا بھی ہرجائی بھی

کب ان راتوں اور آنکھوں کی امجد قسمت جاگے گی
کب وہ سورج روشن ہو گا جو دے گا دکھلائی بھی

◆◆◆

شہرت عروج حسن کی دولت

شہرت عروج حسن کی دولت کسی سے بھی
کرتا نہیں یہ وقت رعایت کسی سے بھی

جو بھی ہوا وہ ایسے ہی ہونا تھا ہو گیا
یعنی نہیں ہے ہم کو شکایت کسی سے بھی

دل ہے کھلی کتاب کی صورت رکھا ہوا
کرتے نہیں ہیں ہم تو سیاست کسی سے بھی

سود و زیاں کا جوڑتے رہتے ہیں جو حساب
کرتے نہیں وہ لوگ محبت کسی سے بھی

آنے کو آ تو سکتا ہے پتھر پہ بھی یہ دل
ہونے کو ہو تو سکتی ہے الفت کسی سے بھی

ہے کون سے زبانٔ یہ کیسے حروف ہیں
کھلتا نہیں ہے عقدۂ قسمت کسی سے بھی

دنیا کی دھوپ چھاؤں پہ تکیہ نہ کیجئے
کرتی نہیں نباہ یہ عورت کسی سے بھی

کیسی چتاونی ہمیں غالب یہ دے گئے
حاصل نہ کیجے دہر میں عبرت کسی سے بھی

امجد تماش بین ہیں سارے یہ غمگسار
کیجے نہ اپنے غم کی وضاحت کسی سے بھی

◆◆◆

ان کھیلی بازی کی ہار

تینتیس برس پہلے
ایسی ہی کسی رت میں
دو خواب سی آنکھوں نے اک بات کہی مجھ سے
اس بات کے مطلب کے
اڑتے ہوئے رنگوں کا مفہوم سمجھنے میں
کیا شام و سحر گزرے
اس رمز کی رم جھم میں
میں روح تلک بھیگا
سرسبز ہوا ایسا
موسم مری گلیوں میں، خوشبو کی طرح پھیلے
شاداب نظر گزرے
وہ بات رہی روشن یوں بھیڑ میں لمحوں کی
جگمگ سے ستاروں کی جس طرح قمر گزرے

تینتیس برس پہلے
اک شام ہوئی ایسی
جس شام کے پہلو میں
جھرنوں کا ترنم تھا، پھولوں کی سواری تھی

کچھ ایسے لگا جیسے اس لطف کا صدقہ تھا
اس شام سے پہلے تک جو عمر گزاری تھی
وہ سامنے بیٹھا تھا اور اس کی گھنی پلکیں
جس وقت مری جانب اٹھنے کو لرزتی تھیں
اک پل کے لیے جیسے موقوف سا ہو جاتا
اس دل کا دھڑکنا بھی
لمحوں کا گزرنا بھی
دریاؤں کا چلنا بھی
ٹوٹے ہوئے جملوں میں، اک رکتا ہوا لہجہ
آواز کے جادو کا ہر انگ سمو جاتا

تینتیس برس پہلے
باہوں کا یہی حلقہ
ویران و تہی حلقہ
اک چاند کا ہالہ تھا
زلفوں کے اندھیرے میں چہرے کا اجالا تھا
سانسوں کی تمازت میں
پھولوں سا بدن جیسے
اک تھان سا ریشم کا جو کھلتا چلا جائے
محجوب سے چہرے پر
موتی وہ پسینے کے

ہونٹوں سے کوئی جن کو بس چھتا چلا جائے
سازِ دلِ مضطر کو
چوڑی کی کھنک جیسے مضراب کی صورت تھی
چڑیوں کے چہکنے میں
پھولوں کے مہکنے میں
اک رنگ کا میلہ تھا اک خواب کی صورت تھی
انگلی سے اگر انگلی
چھو جائے کبھی یوں ہی
وہ لمس کی لذت سے سرشار سا ہو جانا
ہلکی سی کسی رنجش، چھوٹی سی جدائی سے
نیندوں سے بگڑ جانا، تکیوں کو بھگو جانا
اس وقت یہ لگتا تھا
دھرتی کے خزانوں میں
امبر کے تلے جو کچھ موجود ہے اپنا ہے
اس وقت جو آنکھیں ہیں
اس وقت جو سپنا ہے
تا صبحِ ابد اب تو ان کا ہی زمانہ ہے
سنسار کا ہر کونا چاہت کا ٹھکانہ ہے
ہر نقشِ وفا جیسے رنگوں کی کہانی ہے
خوشبو کا فسانہ ہے
اک وصل کے رستے پر ہر خواب روانہ ہے

اس خواب کو دیکھے اب تینتیس برس گزرے
اس شام کو بیتے اب اک عمر ہوئی جاناں
اس زہر کو پیتے اب اک عمر ہوئی جاناں
اس دہر کی وسعت میں تم جانے کہاں ہوگے
انسان زمانے کے منہ زور ہواؤں میں
اس طرح بھٹکتے ہیں
آندھی میں اڑیں جیسے بے سمت سفر پتے
اس وقت کی وحشت میں تم جانے کہاں ہوگے

تینتیس برس پہلے
اس ہجر کے دریا کے اک ریت کنارے پر
اک پل کے لیے ہم تم کچھ دیر رکے لیکن
اب تک نہ کھلا مجھ پر
کس وقت چھوا ہم کو اس موج کے ہاتھوں نے
جس موج کے جادو نے مدہوش رکھا مجھ کو
تم پار گئے جاناں
کیا کھیل تھا وہ جس کو، ہم دونوں نہیں کھیلے
اور ہار گئے جاناں

محبت ایسا نغمہ ہے

محبت ایسا نغمہ ہے
ذرا بھی جھول ہولے میں
تو سر قائم نہیں ہوتا

محبت ایسا شعلہ ہے
ہوا جیسی بھی چلتی ہو
کبھی مدھم نہیں ہوتا

محبت ایسا رشتہ ہے
کہ جس میں بندھنے والوں کے
دلوں میں غم نہیں ہوتا

محبت ایسا پودا ہے
جو تب بھی سبز رہتا ہے
کہ جب موسم نہیں ہوتا

محبت ایسا رستہ ہے
اگر پیروں میں لرزش ہو
تو یہ محرم نہیں ہوتا